افکار و آراء

تفرقۂ اُمت: "الرحیم" ایک سنجیدہ دینی ماہنامہ حیدرآباد سندھ (پاکستان) سے نکلتا ہے۔ اور خصوصی تبلیغ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ اور ان کی تعلیمات کی کرتا رہتا ہے۔ اس کے اگست نمبر میں بڑے سلجھے ہوئے اور حکیمانہ خیالات اُمت کے مختلف فرقوں کے مذہبی اتحاد کے مسئلہ پر ظاہر کئے ہیں۔ ایک پیرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

> "......... دوسری چیز کا اثبات ضروری ہے۔ وہ پاکستان میں مسلمانوں کے جو مختلف مذہبی فرقے موجود ہیں۔ ان کا وجود ہے، یہ فرقے یہاں ہیں اور اگر بحث و مناظرہ سے ان کا ختم ہونا ممکن ہوتا تو اب تک وہ ختم ہو چکے ہوتے، اِن فرقوں کا وجود ہمیں تسلیم کرنا ہوگا۔ اور پاکستان کی ملت میں انہیں وہ حیثیت دینا ہوگی جس کے وہ اپنی تعداد اور دوسرے اثر و رسوخ کی بنا پر مستحق ہیں۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ باہم فکر و بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے اور دینی معاملات میں سرے سے اختلاف آرائی نہ ہو......... یہ زمانہ تو خاص طور سے پُرامن بقائے باہمی کا ہے، اور حالات ریاست ہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین ایسے ملکوں کو جن کے نظام بنیادی طور سے ایک دوسرے کی ضد ہیں مِل جُل کر رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ تو مسلمانوں کے مختلف فرقے جن کے بنیادی عقائد ایک ہی ہیں۔ کیوں باہمی منافرت اور کشاکش کے بغیر نہیں رہ سکتے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے وجود کو تسلیم کرے، اسے حقیقت واقعی مانے، اور یہ نہ ہو جیسا کہ عام طور سے آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض فرقے دوسروں کو حرفِ غلط سمجھتے ہیں جن کا مٹانا اُن کے نزدیک اہم ترین دینی فریضہ ہے"

بات یہ ظاہر اور بالکل سامنے کی ہے۔ لیکن اتنی بات کے منوانے میں بھی لوہے لگ جائیں گے۔ مناظرا

کا تجربہ سیکڑوں برس سے ہو رہا ہے، کوئی فریق ہارماننا جانتا ہی نہیں۔ اور زبان کبھی زبان سے بند ہوئی ہے؟ اس تکلیف دہ حقیقت کو ناگزیر سمجھ کر آگے بڑھنا ہے۔ تبلیغ و تفہیم، بحث و ردّ و قدح کا کام بے شک جاری رہے۔ اسے ہرگز نہ روکیئے۔ لیکن خدا کے لئے حدود اس کے مقرر کر لیجئے۔ اور اس سے آگے نہ بڑھیئے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی سا بھی اختلافی و نزاعی مسئلہ وحدتِ کلمہ و اشتراکِ قبلہ پر غالب آجائے اس کی ایک جھلک ۱۹۱۹ و ۱۹۲۰ء میں تحریکِ خلافت کے زمانے میں نظر آگئی تھی۔ اور ہندوستان میں سارے کلمہ گو فرقے اپنے اختلافات کو دبا کر اُمتِ واحد کی طرح صف بستہ میدان میں آگئے تھے (یہاں تک کہ وہ فرقے بھی جن کے ہاں خلافت کا کوئی مسئلہ ہی سرے سے نہیں ہے) پھر اس سے جو برکت ظاہر ہوئی تھی۔ وہ بہتوں کو تو اب بھی یاد ہوگی۔ اور بعد کی آنے والی نسلیں اسے کتابوں اور رسالوں، اخباروں کی پرانی فائلوں میں دیکھ سکتی ہیں۔ اور اُمت کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ دَور دو تین سال سے زائد قائم نہ رہ سکا۔

(صدق جدید لکھنؤ۔ ۱۲؍اکتوبر ۶۶ء)

جوابی محاذ: ماہ نامہ فکر و نظر (راولپنڈی) میں .... کے سنجیدہ قلم سے:۔

> "سعودی مملکت کی وزارتِ اطلاعات انگریزی زبان میں اپنا ایک ہفت روزہ پرچہ نکالتی ہے۔ اس کی ۱۴؍جون کی اشاعت میں ملک میں پہلے پنج سالہ اقتصادی ترقیاتی منصوبے کے تشکیل پذیر ہونے کی خبر ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ منصوبہ بندی کی مرکزی کمیٹی کے صدر نے کل اقتصادی رپورٹ کی تکمیل اور مختلف وزارتوں اور سرکاری ایجنسیوں سے پنجسالہ اقتصادی ترقیاتی پروگرام کے بارے میں اپنی بحث و تحیص ختم کر لینے کا اعلان کیا ہے۔ اب یہ رپورٹ اور پروگرام جملہ وزارتوں اور ذمہ دار حلقوں کو اظہار رائے کے لئے بھیجے جائیں گے۔ اور اس کے بعد انھیں اعلیٰ حضرت شاہ فیصل کے سامنے پیش کیا جائے گا"

تو ہوئی خبر اور اب اس پر تبصرہ:۔

یہ سعودی عرب کا پہلا پنج سالہ اقتصادی ترقیاتی منصوبہ ہے۔ اس کے بعد لازماً دوسرا منصوبہ آئے گا۔ اور پھر تیسرا اور چوتھا۔ اور جب اقتصادیات میں منصوبہ بندی آجائے۔ اور پانچ یا دس یا پندرہ سال بعد ملک میں جو تعمیری اقتصادی ترقی کی جانے والی ہو اس کا پہلے سے حساب کر لیا جائے۔ تو زندگی کے دوسرے شعبے ذہنی، اخلاقی

اور مذہبی اس منصوبہ بندی سے باہر کیسے رہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی ہمہ گیر منصوبہ بندی کے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ سب کو معلوم ہیں "

اہم ترین فقرہ کو نقل میں قصداً زیرِ خط کر دیا گیا۔ یہ وہی نجدی حضرات ہیں۔ جو ابھی کل تک اپنے افراطِ جوشِ دینی کے لئے بدنام تھے اور شریعت کے کسی ادنا سے ادنا جزو کی بھی بے حرمتی دیکھ کر تڑپ اُٹھتے تھے! اور بے ضرر سی بھی نئی بات کو بے دھڑک بدعت کہہ اُٹھتے تھے!

زمانے کی ہوا کو کون روک سکا ہے۔ ضرورت غصہ کرنے اور جوش دکھانے کی نہیں۔ سنجیدگی سے غور کرنے کی ہے کہ حکومت حجاز کے اس نو پیدا ترفہ و ترفع (مالی و معاشی خوش حالی اور جاہ و مرتبہ کی بلندی) کا رُخ کس طرح اسلامی رنگ کے تعمیری پہلوؤں کی طرف موڑ دیا جائے — یہ کام دین کے ایسے فاضلوں کے انجام دینے کا ہے جو اخلاص و ثباتِ ایمان کے ساتھ ایک طرف تو تفقہ فی الدین کی دولت سے سرفراز ہوں (محض جزئیاتِ فقہ کے حافظ نہ ہوں) فطرتِ بشری کی کمزوریوں اور نفسیاتِ بشری کی نزاکتوں کا علم رکھتے ہوں (محض جوشیلے نعروں کے خوگر نہ ہوں) اور دوسری طرف جدید معیشت و معاشرت کی فکری و جذباتی بنیادوں پر بھی نظر رکھتے ہوں۔ جب جا کر اور بڑے صبر و تحمل و عالی ظرفی سے کام لینے کے بعد ایک جوابی محاذ تیار کر سکتے ہیں۔

(صدق جدید لکھنؤ۔ ۱۴ر اکتوبر ۶ء

* * *

علمائے کرام اور حکومت:

ہمارے ایک دینی رسالے نے "علماء اور حکومت" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:۔

"............ بجائے خود اختلافات" کوئی اَن ہونی بات نہیں اور نہ ہی تنقید و اعتراض کوئی ناقابلِ تصور شے ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو ان علماء اور عمائدینِ حکومت کے مابین رابطہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی بات براہِ راست سنیں اور دُور دُور رہنے کے باعث جو بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ ان کے دور کرنے کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ اور نہ ہی ان دونوں کے مابین کوئی ایسا وسیلہ ہے جو افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرے۔

رسالے کے محترم مدیر نے "حکومت کی بہی خواہی اور ملک و ملت کی بہبود سے دلی محبت رکھنے کی بنا پر" اربابِ اختیار کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی ہے "کہ حکومت اور علماء کے مابین موجودہ صورتحال قابلِ رشک نہیں ہے، بلاشبہ ایک خاص طبقہ علمائے حکمرانوں کے تعلقات بہتر ہیں لیکن متعدد دوسرے

طبقات اہلِ علم کے ایسے ہیں، جن سے نہ حکومت خوش ہے اور نہ وہ حکومت سے راضی ہیں۔"

مدیر محترم نے اس پر افسوس کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے "کہ نتیجہ اس صورتِ حال کا یہ ہے کہ نہ حکومت علماءِ دین کی صلاحیتوں، ان کے اثر و رسوخ سے ملک و ملّت کو سلکِ اتحاد میں پرونے کا کام لے رہی ہے، اور نہ ہی علماء حکومت کے وسائل اور حکمرانوں کے اثر و رسوخ کو اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔"

اور آخر میں صاحبِ موصوف ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اس مایوس کن فضا میں کیا ہو؟ کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی، اگر اصحابِ نظر میں سے کوئی صاؔ روشنی کی کوئی کرن مہیا کر سکیں، تو ہم ان کے ممنون ہوں گے۔"

حکومت اور علماءٔ کے متعدد طبقوں کے درمیان اس وقت باہمی تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟ اس کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے۔ لیکن اگر وہ بقول مدیر موصوف حکومت سے راضی نہیں تو یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔ "الرحیم" کی پہلے دن سے یہ کوشش ہے کہ ایک مسلمان معاشرہ اور ایک مسلمان سلطنت میں علماءِ کرام کا جو مقام ہے وہ پاکستان میں قائم رہے اور ان میں اور حکومت میں کسی طرح کی منافرت پیدا نہ ہو۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ مسلمان ملک صدیوں کے جمود کے بعد بیدار ہو رہے ہیں، اور جیسے جیسے وہ غیر ملکی غلامی سے آزاد ہوتے ہیں اور عنانِ اقتدار ان کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ اپنے آپ کو دوسرے غیر مسلم ملکوں سے زندگی کے ہر شعبے میں بہت پیچھے پاتے ہیں۔ ان میں وہ وحدت اور جذباتی ہم آہنگی نہیں، جو اس زمانے میں ایک ملک کو داخلی لحاظ سے مربوط اور خارجی جارحیت سے محفوظ رکھنے کی سب سے مقدم شرط ہے۔ ان میں تعلیم بہت کم ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی معیشت میں دوسروں کے محتاج ہیں، اور ان کی اقتصادی اور فنی مدد کے بغیر وہ اپنی پستی اور بدحالی کو ترقی اور خوش حالی میں نہیں بدل سکتے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان ملک یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر وہ اپنی اس پستی اور بدحالی کو جلد سے جلد دور نہ کر سکے، تو ان کے ہاں نہ اندرونی امن رہے گا اور نہ وہ قوموں کی برادری میں کوئی باعزت جگہ لے سکیں گے۔ مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو اس سنگین صورتِ حال کا احساس ہے اور ہر حکومت اپنے اپنے ملک کے حالات کے مطابق اس سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس ضمن میں وہ اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کرتیں اور ان پر اپنے عوام سے عمل کرانے میں کوشاں ہیں۔ چونکہ یہ ایٹمی

دور ہے۔ جس میں زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے میں بڑے قدم اٹھائیں اور جلد جلد قدم اُٹھائیں، علامہ اقبال کے الفاظ میں کاروانِ ہستی اتنا تیز گام ہے کہ جو اس کے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکے، وہ اس کی لپیٹ میں آکر کچلا جاتا اور گردِ راہ ہو جاتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے بعض علماء ان حقائق گرد و پیش کو صحیح طرح محسوس نہیں کرتے، اور موجودہ زمانے کی نوعیت اور اس کی تیز رفتاری سے پیدا ہونے والے نتائج سے کما حقہٗ واقف ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اب یہ علماء زیادہ سے زیادہ اپنے مخصوص حلقوں میں رہتے ہیں جو بیشتر ان کے نیاز مندوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو اپنے عوام کی ضرورتیں پوری کرنا ہیں۔ ان کو داخلی اور خارجی خطرات سے محفوظ رکھنا ہے اور پھر بین الاقوامی حالات و ظروف میں اپنے اپنے ملکوں کے لئے سازگار فضا پیدا کرنا ہے۔ ہمارے اکثر علماء مسلمان حکومتوں کی ان ذمہ داریوں کو نہیں جانتے، اور ان میں سے ہر گروہ یہ چاہتا ہے کہ مثال کے طور پر صدر ایوب اس کی بات سنے اور وہی کرے، جو یہ گروہ کہتا ہے کیونکہ بقول اس گروہ کے صحیح اسلام یہی ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت اور علمائ کے اکثر گروہوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے۔

زیادہ دن نہیں ہوئے ایک بہت بڑے عالی مرتبت عالم دین نے اپنے دینی رسالے میں لکھا تھا کہ صدر ایوب نے آئین و دستور کی یہ کیا بحث چھیڑ رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے صدارتی انتخاب میں کامیاب کیا ہے، اُسے چاہیئے کہ عدالتوں میں دوسرے ججوں کے ساتھ ساتھ ایک حنفی عالم مقرر کر دے، اسلامی قانون کی نئی ترتیب و تشکیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قانون پہلے سے موجود ہے بس ہر عدالت میں ایک حنفی عالم جج ہونا چاہیئے اس طرح ملک میں اسلامی آئین بروئے کار آجائے گا۔

—— ایک اور عالمِ دین نے حال ہی میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی عظیم الشان حکومتیں مالِ غنیمت اور فئی سے چلتی رہی ہیں۔ اب یہ ٹیکسوں وغیرہ کی رٹ کیا لگا رکھی ہے۔

—— ایک اور صاحب مرقوم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے گزشتہ ستمبر میں پاکستان فتح دی ہے، اس لئے حکومتِ پاکستان کا ریڈیو سے ۲۵ر دسمبر کو ایک عیسائی کو تقریر کرنے کی اجازت دینا صحیح نہیں۔ اس طرح کے روزمرہ کے ہزاروں مسائل ہیں جن کے بارے میں علماء صبح و شام حکومت کو مشورے دیتے ہیں، اور ظاہر ہے حکومت ان پر عمل کرنے سے معذور ہوتی ہے۔ اس پر حکومت کے خلاف زبان و قلم کی باڑھیں کھل جاتی ہیں۔